ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154

Volume.7, Issue.1 (2024)
(January-Mrach)

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154

A Comparative Analysis of Village Characters in the Fictions of Ahmed Nadeem Qasmi and Mansha Yaad

احمد ندیم قاسمی اور منشا یاد کے افسانوں میں دیہاتی کرداروں کا تقابلی جائزہ

Dr. Mamuna Subhani
Dr. Sadaf Naqvi
Munaza Younas
Associate Professor, Urdu, Government College University Faisalabad
Assistant Professor, Urdu, Government College Women University Faisalabad
MPhil scholar, Urdu, Government College University Faisalabad

Abstract

The portrayal of village characters in literature is a common theme explored by numerous authors. In this paper, a comparative analysis is conducted on the village characters represented in the fiction of Ahmed Nadeem Qasmi and Mansha Yad, two prominent writers. This analysis aims to examine the similarities and differences in the portrayal of village characters in their respective works. Through a close reading and content analysis of selected stories. Ahmad Nadeed Qasmi is a well-known poet, columnist and fiction writer, on other hand Mansha Yad was a well-known fiction writer. Both writers had a separate place in literature, but both write for the poor and village characters more often.

Keywords: Qasmi, Mansha yad, Village, Characters, poor, women

احمد ندیم قاسمی کا خاندان میں نام احمد شاہ تھا۔ ادبی نام احمد ندیم قاسمی اور تخلص ندیم تھا۔ ''احمد ندیم قاسمی ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع سرگودھا کی تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے''(۱)۔ احمد ندیم قاسمی کا نام بطور شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، کالم نویس اور مدیر ادبی دنیا میں مقبول و معروف ہے۔ آپ اپنی ہمہ جہت شخصیت کے باعث ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ آپ نے اپنے قلم کی کرشمہ سازیوں سے ادب کو اعلیٰ پائے کی تخلیقات سے روشناس کرایا اور جہان ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ آپ کی تصانیف میں چوپال(۱۹۳۹ء)، بگولے (۱۹۴۱ء)، طلوع وغروب(۱۹۴۳ء)، گرداب (۱۹۴۳ء)، سیلاب وگرداب (۱۹۴۳ء)، آنچل (۱۹۴۲ء)، آبلے (۱۹۴۸ء)، درودیوار (۱۹۴۹ء)، سناٹا(۱۹۵۲ء)، بازار حیات (۱۹۵۹ء) برگ حنا(۱۹۵۹ء)، گھر سے گھر تک (۱۹۶۳ء)، نیلا پتھر (۱۹۷۰ء)، کپاس کا پھول (۱۹۷۳ء) اور کوہ پیما(۱۹۹۵ء) خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے افسانہ نگاری کی صنف میں بھی اوج کمال حاصل کیا اور اپنے معاصر افسانہ نویسوں میں ممتاز و منفرد مقام پایا۔ آپ نے اپنے اکثر افسانے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے۔ جس میں دیہات کی سماجی حقیقتوں اور معاشی ناہمواریوں کو موضوع بنایا آپ کے بیشتر افسانے پنجاب کے دیہاتوں میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں کسان، زمیندار، محنت کش، ان کے بیوی بچے، ان کے کھیت کھلیان، ان کے عقائد و نظریات، ان کی داستان محبت، ان کی محرومیاں اور مجبوریاں سب کی

عکاسی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ آپ کے افسانوں میں جنگ کی تباہ کاریاں، تقسیم، ہجرت اور فسادات کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی اور بربریت کی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔زمیندار کے ہاتھوں مزدوروں اور محنت کشوں کا استحصال اور طبقاتی تفاوت آپ کے افسانوں کا اہم موضوع رہے ہیں۔

افسانہ ''السلام علیکم''جو احمد ندیم قاسمی کے مجموعے ''بگولے'' سے لیا گیا ہے۔اس میں دیہات میں رہنے والے ایک خاندان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔شوہر جو اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر مسیو اور مصر کے محاذ جنگ پر چلا جاتا ہے۔تین برس کے بعد جب واپس آتا ہے تو اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔اور پھر وہی شخص جب واپسی پر اس کو سلام کہتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب دیہاتوں میں وہ لوگ موجود نہیں ہیں جو سادگی کا حسین مرقع تھے۔اس افسانے میں ایک طرف دیہاتیوں کے بدلتے ہوئے رویے دکھائے گئے ہیں تو دوسری طرف احمد ندیم قاسمی بتانا چاہتے ہیں کہ شوہر جب تین برس مصر میں گزارتا ہے تو خود کسی انجان عورت کی محبت میں مبتلا رہتا ہے۔مگر اپنی بیوی کو اس حالت میں پا کر اسے بے وفا کہتا ہے۔کیوں؟وفاداری کے اصول تو سب پر ایک ہی طرح لاگو ہوتے ہیں خواہ وہ کوئی انگریز خاتون ہو یا کوئی مشرقی دوشیزہ۔بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان:

''قاسمی صاحب کی ابتدائی کہانیاں اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ہمارے شعور میں روشنیاں بکھیرتی ہیں۔
ان کے ہاں دیہات کا صرف رومانی روپ نہیں تھا وہ اس فردوس میں جلتے ہوئے گھر دیکھتے اس لیے
ان کی واقعیت نگاری اور قوت مشاہدہ اثر انگیز تھی۔انہوں نے پنجاب کے خاص علاقائی ماحول اور اس
کے کرداروں کو اردو ادب کا حصہ بنایا۔)''۲(

افسانہ ''طلائی مہر''احمد ندیم قاسمی کے مجموعے ''بگولے'' سے لیا گیا ہے۔جس میں اکثر افسانے محبت اور سماج، محبت اور روزگار، محبت اور حکومت کی کش مکش کے آئینہ دار ہیں۔ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سماج، روزگار اور حکومت یہ تینوں معاشرتی ادارے اکثر محبت کا گلا گھونٹ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

افسانہ طلائی مہر میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک کسان کی محبت ظالم سماج کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔فیض کا کردار ایک دیہاتی محنت کش کسان کا ہے جو گاؤں کے تھانیدار کے منع کرنے کے باوجود اپنی فصل بیچنا نہیں چھوڑتا۔وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے۔تھانیدار کے منع کرنے کے باوجود فیض نے اپنی فصل بیچ کے بیس دنوں میں چودہ روپے جمع کر لیے اور قصبے کے سنار سے ایک مہر بنوالی۔اسی دوران اسے سونی سے محبت ہو جاتی ہے جو گاؤں کے بوڑھے چوکیدار کی بیٹی ہے۔فیض اپنی محبت میں تو کامیاب ہو جاتا ہے مگر ایک غریب کسان ہونے کی وجہ سے گاؤں کے ظالم تھانیدار کی ہیبت کا نشانہ بن جاتا ہے۔اندھیری شام کو گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پر تھانیدار اور اس کے سپاہیوں نے فیض کو دبوچ لیا اور پھر ادھ موئے فیض کو چوکیدار کے سامنے پھینک کر تھانیدار پکارا:

''راتوں کو چھپ چھپ کر اس نے کیاریوں کو پانی دیا ہے۔اور گوبھی کے پھول بیچے ہیں میرے
حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کا انجام تمہارے سامنے ہے۔''(۳)

''طلائی مہر''میں فیض اور سونی کی الفت کے درمیان ایک تھانیدار کی بربریت دیکھائی گئی ہے۔اس افسانے میں کسان کی ان مشکلات کو دیکھایا گیا ہے جن سے ایک غریب شخص کی شخصی محبت مجروح کی جاتی ہے۔

افسانی ''توبہ میری''احمد ندیم قاسمی کے مجموعے ''بگولے'' سے لیا گیا ہے۔اس افسانے میں دیہاتی کردار ایک بوڑھا کسان اور اس کی بیوی ہیں۔جنہوں نے اپنے بیٹے کریم کی شادی کے سپنے سجائے ہیں۔نوجوان کریم ایسا باہمت کسان ہے جو بیماری کی حالت میں بھی گاؤں کے مالک صاحب کا سامان رات کے وقت دوسرے گاؤں میں چھوڑ آنے کو

تیار ہو جاتا ہے۔ مگر اسی دوران اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ کریم خان کی موت اس لیے نہیں ہوئی کہ اس کو بھوت پریتوں نے رات کے وقت کھا لیا بلکہ اس کا کلیجہ کھا جانے والے وہ لوگ ہیں جو استعداد رکھتے ہوئے بھی اس کی بیماری کے دنوں میں اس کی مدد نہیں کرتے۔

ملک جی رات کے وقت کریم کے گھر آنے اور اسے اپنا سامان دوسرے گاؤں پہنچانے کا کہتے ہیں مگر بوڑھا اور بڑھیا کریم کو منع کرتے ہیں۔ مگر کریم بولا:

> "کمبل اوڑھ لوں گا۔ اگر ہم لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر یوں آرام کرنے لگے تو پیٹ کیسے بھرے گا۔"(۴)

یہی وہ سماج کا چکر ہے جو کریم کو بیماری کی حالت میں بھی کام کے لیے چھکڑا چلانے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ راستے میں اسے سردی لگ جاتی ہے اور وہ اپنے چھکڑے پر بیٹھے بیٹھے جاں بحق ہو جاتا ہے۔

افسانہ "سرخ ٹوپی" دوسری جنگ عظیم سے متعلق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اپنے سپاہی خاوند کو نوبیاہتا کس طرح فخر اور احترام کے ملے جلے جذبات کے دیکھتی ہے اور گاؤں کی دوسری عورتیں بھی اس پر رشک کرتی ہیں۔ ایک سپاہی اپنے گاؤں کے لیے باعث افتخار ہوتا ہے۔ مگر گاؤں کے ایک نمبر دار نے اس سپاہی کے خلاف رپورٹ کر کے اس کی نوکری چھڑوا دی۔ نمبر دار نے گاموں کا وہ خط پڑھ لیا جو اس نے اپنی بیوی کے نام لکھا تھا۔ نمبر دار چوپال میں بیٹھا کہہ رہا تھا:

> "گاموں بڑا بدمعاش ہے۔ ریشمی قمیضوں اور سنہرے جھمکوں کی باتیں بدمعاش ہی خطوں میں لکھا کرتے ہیں۔"(۵)

نمبر دار نے گاموں کی رپورٹ کیوں کی؟ اس لیے کہ گاموں شہری مسلمانوں کی تقلید میں سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ بعض اوقات حقیقت سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی سے زیادہ سرخ اور خوش ہوتی ہے اور معصوم گاموں اور اس کے خلاف رپورٹ کرنے والے نمبر دار ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں۔

افسانہ "گڑیا" میں سیدھے سادھے دیہاتی کرداروں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ دونوں کردار دو سہیلیاں مہراں اور بانو ہیں۔ ایک کردار بانو زمیندار کی بیٹی ہے جبکہ دوسرا کردار مہراں اس زمیندار کے نوکر کی بیٹی ہے۔ دونوں کی دوستی کے درمیان ہمارے سماج کے امیر اور غریب طبقے کے درمیان کی سوچ حائل ہے۔ احمد ندیم قاسمی بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے سماج میں امیر اور غریب کی دوستی تو ہو سکتی ہے مگر ہمارا معاشرہ اس دوستی کو قبول نہیں کرتا۔ اور یہی ان دونوں سہیلیوں کے ساتھ ہوا۔ مہراں بہت خوبصورت ہے مگر غریبی اور مفلسی نے اس کی زندگی کی خوبصورتی چھین لی ہے۔ دونوں سہیلیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ مہراں جب اسی مفلسی کا شکار ہو کر کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پر یہاں ہمارے دیہاتی لوگ اس قدر سیدھے سادھے ہیں کہ انسان کی تنہائی یا بیماری کو نہیں سمجھتے بلکہ قدیم سوچ میں پڑ کر توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مہراں کے دکھ کو سمجھنے کی بجائے اس کے بارے میں یہ کہنا شروع ہو جاتے ہیں کہ اس میں کوئی جن یا پری ہے۔ جو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس پر عاشق ہے۔ دونوں سہیلیوں کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ گڑیا کا تھا جو مہراں نے بانو کو دی تھی اور بانو نے اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ جب بانو کی گڑیا ٹوٹ گئی تو مہراں کی موت بھی واضح ہو گئی۔

بانو کی ماں بولی:

> "ہائے میں نہ کہتی تھی میری بچی کہ مہراں کوئی جن ہے یا پری ہے۔"(۶)

افسانہ "سفارش" میں بھی ایک سیدھا سادھا دیہاتی کردار فیکا کوچوان کا ہے۔ فیکا کوچوان کا باپ شدید بیمار ہے۔ اس کا علاج کروانے کے لیے ڈاکٹر اس کی بات نہیں سنتا۔ اب وہ اپنے صاحب سے کہتا ہے کہ ڈاکٹر سے اس کے باپ کے علاج کی بات کرے۔ اسی افسانے میں فیکے اور صاحب کے دونوں کرداروں کے توسط سے ہمارے سماج میں دو طبقوں کا فرق دکھایا گیا ہے۔ پہلے تو دکھایا گیا ہے کہ صاحب کی اپنی اتنی مصروفیات ہیں کہ وہ فیکے کا کام کر ہی نہیں پاتا۔ اسے کوئی احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کی لاپرواہی سے فیکے کے باپ کی جان

بھی جاسکتی ہے۔ مگر فیکا اپنی تگ و دو جاری رکھتا ہے اور اپنے باپ کا علاج کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر نے صاحب کے کہنے پر اس کے باپ کا علاج کیا ہے۔ مگر یہ اس کی سادگی تھی۔ اسے کہاں معلوم کہ صاحب کو تو اس بات کا یاد بھی نہیں ہے۔ باپ کے صحت مند ہونے پر فیکا صاحب کا شکریہ ادا کرنے جاتا ہے۔

فیکا بولا:

> ''بابو جی کچھ سمجھ نہیں آتا کہ آپکا شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں۔ میرا ابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے بھی دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا۔ قسم خدا کی میں عمر بھر آپکا نوکر رہوں گا۔''(۷)

بابو جی کے کردار کے ذریعے ہمارے امیر طبقے کی بناوٹی زندگی اور اپنی شان بڑھانے کے لیے غلط بیانی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ کس طرح یہ سیدھے سادھے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ افسانے میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ جب فیکے کا شکریہ ادا کرنے پر بابو جی بولتے ہیں:

> ''کوئی بات نہیں فیکے کوئی بات نہیں۔''(۸)

افسانہ ''ماسی گل بانو'' جو احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ ''کپاس کا پھول سے لیا گیا ہے۔ ماسی گل بانو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ جو زندگی کے تھپیڑے کھا کھا کر اس قدر تلخ مزاج ہو گئی ہے کہ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس میں جن آ گئے ہیں۔ مگر یہ معاشرے کا المیہ ہے کہ وہ انسان کے ء تنہائی میں چھپا ہوا درد دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس افسانے میں ماسی گل بانو ایک دیہات کا سیدھا سادھا کردار ہے۔ جو کسی زمیندار کے بیٹے سے محبت کی شادی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ مگر شادی کے روز اس کا ہونے والا شوہر کسی حادثے میں مر جاتا ہے۔ ماسی گل بانو کی مہندی اس کا سرخ جوڑا سب کچھ ویسے ہی ماتم میں ڈوب جاتا ہے۔ ماسی گل بانو کی موت اس کی وحشت ناک تنہائی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ جب لوگ اسے مردہ پا کر اٹھا کر اندر لے گئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں

> ''پورا کوٹھا مہندی کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ چارپائی پر صاف ستھرا کھیس بچھا تھا۔ چاروں طرف رنگ رنگ کے کپڑے اور برتن پیڑھیوں اور کھٹولوں پر دلھن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف آئینے کے پاس کنگھی رکھی تھی۔ ماسی کو صاف ستھرے کھیس پر لٹا دیا گیا اور اسے اس کے ریشمی دوپٹے سے ڈھانپ دیا گیا۔''(۹)

افسانہ ''بین'' کے مرکزی کردار سیدھے سادھے دیہات کے والدین ہیں۔ جو ہمارے معاشرے کی فرسودہ روایات کی پیروی اس قدر کر رہے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی ان روایات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ گاؤں میں موجود سائیں حضرت شاہ کا کردار ایک سفاک اور وحشی کردار ہے۔ جو بظاہر تو ایک نیک پاک انسان دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی اسی بناوٹ سے گاؤں کے سیدھے سادھے دیہاتی لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ بوڑھے والدین اپنی لاڈلی بیٹی کو اس سائیں کے کہنے پر دربار میں بیٹھا دیتے ہیں۔

افسانہ ''میرا دیس'' میں سیدھے سادھے دیہاتی کردار دکھائے گئے ہیں۔ ان کرداروں کی زندگی کس قدر مشکلات کا شکار ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار دیہات کی وہ مجبور و بے کس لڑکی ہے۔ جو جوانی کے شباب میں اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی بجائے اپنے بوڑھے ماں باپ اور ننھے بھائی کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ جبکہ ان سیدھے سادھے دیہاتیوں کی مجبوریوں سے جاگیر دار طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا دوسرا بڑا المیہ ہے۔ ماں باپ اور بھائی کی زندگی میں خوشیاں اسی صورت میں لا سکتی ہے جب وہ خود اپنی خوشیاں قربان کر دے۔ وہ کتنی بے بس لگتی ہے وہ جب زمیندار کی باتوں کا جواب یہ کہہ کر دیتی ہے:

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2024)
(January-Mrach)

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ میری جوانی چاہتے ہیں نا لے لیجئے اور مجھے رخصت کیجئے کہ
میرے بوڑھے ماں باپ پڑے کراہ رہے ہوں گے۔ آپکی یہ مہربانی کیا کم ہے کہ شام کی اس زرا
سی رومانی اور جسمانی محنت کا صلہ آپ یوں دے رہے ہیں کہ میرے بوڑھے باپ کو ایک بیگھ
زمین کاشت کے لیے دے رکھی ہے۔''(۱۰)

عمراں کا کردار گاؤں کی مظلوم بے کس لڑکیوں کی آواز ہے۔ جبکہ زمیندار ہمارے معاشرے کا وہ مکروہ کردار ہے جو اپنی دولت کے بل بوتے پر دندناتے بھرتے ہیں اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ''دیہاتی ڈاکٹر''افسانہ میں ایک ڈاکٹر کا کردار اور گاؤں کے معصوم اور سیدھے سادھے لوگوں کے کردار پیش کیے گئے ہیں کہ کس طرح ڈاکٹر جو کہ عوام کا مسیحا کہلاتا ہے وہ اپنے فرائض سے پہلو تہی کرتا اور دہقان اور کسان اس کی لاپرواہی کا شکار ہو کر اپنی زندگیاں گنوا بیٹھے ہیں۔

منشا یاد کا شمار اردو ادب کے نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ''آپ ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں ٹھٹھہ نستر میں پیدا ہوئے۔''(۱۱)ان کا نام محمد منشا تھا لیکن علمی و ادبی حلقوں میں منشا یاد کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ''ماس اور مٹی(۱۹۷۰ء)، بند مٹھی میں جگنو(۱۹۷۵ء)، خلا اندر خلا(۱۹۸۳ء)، وقت سمندر(۱۹۸۶ء)اور درخت آدمی(۱۹۹۰ء)، تماشا(۲۰۰۵ء)، خواب سرائے(۲۰۰۵ء)، دور کی آواز(۲۰۰۹ء)، اک کنکر ٹھہرے پانی میں(۲۰۱۰ء)'' شامل ہیں۔

منشا یاد نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس کے مشاہدات و تجربات وسیع و عمیق ہیں۔ وہ بناوٹ کے پردوں میں چھپے ہوئے انسان کی فطری، معصوم اور سچی تصویریں جس سلیقے سے لفظوں میں اتار لیتے ہیں وہ ان کا خاصہ ہیں۔

''درخت آدمی''اس افسانے میں منشا یاد نے ایک دیہاتی بزرگ کا کردار دکھایا ہے۔ ایک سادھا دیہاتی بزرگ جس کو درختوں سے اس قدر لگاؤ ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کرنا ہی اپنی زندگی سمجھتا ہے اور وہ اپنے گاؤں سے ایک پل کے لیے بھی الگ ہونا نہیں چاہتا۔ اس کی ایک بیوہ بیٹی ہے جو اس کے ساتھ گاؤں میں رہتی ہے۔ گاؤں کا چودھری شہر میں جا کر آباد ہو جاتا ہے۔ اس نے کسی نا کسی طرح کرموں کو بھی شہر کے درختوں کا معائنہ کروایا۔ تاکہ اس کا دل لگ جائے۔ بہر حال کرموں اور اس کی بیٹی کا شہر میں دل تو لگ گیا مگر جیسے گاؤں میں چودھری کے بیٹے نے باغ کو ختم کر دیا تھا اور وہاں کوئی عمارت کھڑی کر دی تھی۔ اسی طرح اب جب کرموں ان درختوں سے مانوس ہو گیا ہے تو چودھری نے اس چھوٹے باغیچے کو ختم کرنے کا کہا تا کہ یہاں پر کوئی اچھی عمارت کھڑی کی جاسکے اور کرموں کو وہ درخت کاٹنے کا کہا جس کو اس نے دل و جان سے سینچا تھا۔ چودھری صاحب نے کرموں کو جب درخت کاٹنے کا کہا تو اس نا چاہتے ہوئے درخت کاٹ دیا مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود اپنے آپ کو کاٹ رہا ہے۔

''چودھری صاحب اور گھر والی ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ سب لوگ اپنی مصروفیت میں مگن تھے کہ
اچانک درخت کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی کرموں کی ایسی چنگھاڑ جس کے بارے
میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ چیخ تھی یا نعرہ''(۱۲)

سب لوگ دوڑتے ہوئے پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ درخت گرا پڑا ہے اور خون میں لت پت کرموں اس کے نیچے دبا ہوا ہے۔

منشا یاد کا افسانہ ''چھوٹے بڑے لوگ''اس میں ایک دیہاتی خاندان دکھایا گیا ہے جو اپنوں سے بچھڑ کر اس گاؤں میں آباد ہو گیا۔ جو اپنوں سے بچھڑ کر اس گاؤں میں آباد ہو گیا اور اپنی جان بچانے کے لیے اس بزرگ نے اپنی ذات پات ہی بدل ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی جان تو بچ گئی مگر اسے گاؤں میں چمار ہی سمجھا جانے لگا۔ اور اس کا بیٹا جو پڑھ لکھ گیا تھا مگر آخر اس کو بیٹا تو چمار ہی کا کہلانا تھا۔ اب گاؤں کے بیٹے کو گاؤں کے چودھری کی بیٹی سے محبت ہو گئی تو اس نے یہ راز کھولا کہ وہ بھی انہی چودھریوں کی نسل میں سے ہے۔ بس کسی

مجبوری نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چودھری نے کافی تفتیش کروائی اور آخر کار اس سیدھے سادھے دیہاتی بزرگ کی مان لی گئی۔ اس کے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس افسانے میں ہجرت کے وقت کی کربناک حالت دکھائی گئی ہے جب انسان کو اپنی جان بچانے کے لیے اس قدر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ اپنی ذات پات ہی بدل ڈالتا ہے۔

''سلاٹر ہاؤس'' یہ افسانہ ہمیں ایسے کرداروں کی تصویر دکھاتا ہے جو اپنے انتقام کی خاطر اپنے ارد گرد کے سارے ماحول کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ اس افسانے میں منشا یاد نے ایک خوبصورت گاؤں کی تصویر کشی کی ہے۔ اس میں رہنے والے لوگوں نے اپنے اندر بھڑکنے والی انتقام کی آگ سے اس کی زمین کو خون آلود بنا رکھا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار گاؤں میں رہنے والا نوجوان ہے۔ جس نے اس گاؤں میں اپنا بہت اچھا بچپن گزارا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ گاؤں ایک خون گاہ بن گیا ہے۔ اسی لیے تو اس افسانے کا ایک کردار کہتا ہے:

''یہ دنیا واقعی ایک سلاٹر ہاؤس ہے ایک بوچڑ خانہ۔''(۱۳)

یہ نوجوان اپنے گاؤں سے دور اس لیے جاتا ہے کہ وہ امن و سکون کو تلاش کر سکے مگر اسے کیا معلوم کہ زندگی قیمت ہر جگہ کم ہی ہے۔ انسان کو کوڑیوں کے عوض ختم کر دیا جاتا ہے۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا مگر یہاں جس قدر ترقی ہے اسی قدر انسانیت کی قدر و قیمت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں انسان پیار اور محبت سے رہنے کی بجائے قتل و غارت گری میں الجھ کر اپنی زندگی کو جیتے جی جہنم کا نمونہ بنا رہا ہے۔ افسانہ ''کرموں والی'' کا مرکزی کردار گاؤں کی ایک سیدھی سادھی عورت ہے جس کا شوہر فوت ہو جاتا ہے۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اب وکیا ہمسائے کی نیک خاتون اس کو ایک بھینس دے دیتی ہے جس کا نام کرموں والی رکھا جاتا ہے۔ یہ بھینس ان کی زندگی کا سہارا بن جاتی ہے۔ یہاں پر مصنف نے انسان کے بدلتے ہوئے رویے دکھائے ہیں کہ کس طرح انسان اب گاؤں میں رہنے کے باوجود بدلتے جا رہے ہیں۔ دیہاتی ماحول اب ویسا نہیں رہا جو پہلے ہوتا تھا۔ جس عورت نے اس غریب عورت کی مدد کی تھی اچانک وہی عورت اپنے حالات خراب ہو جانے کی وجہ سے اس سے حسد کرنے لگ جاتی ہے اور اس پر الزام تراشی کروا کر بھینس کو زمین میں گاڑھ دیتی ہے۔ عورت چیختی چلاتی ہے مگر گاؤں کے لوگ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس افسانے میں ہمارے سماج کے کھوکھلے اور جھوٹے جاگیر داروں کے فیصلوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جو اپنے جھوٹے فیصلے سنا دیتے ہیں مگر ان فیصلوں سے کتنے غریبوں کی زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں اس کے بارے نہیں سوچتے۔

افسانہ ''خریدی ہوئی نصیحت'' کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جو ہماری نوجوان نسل کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو بتانا چاہتا ہے کہ بزرگوں کی نصیحت آموز باتیں کبھی بھی فراموش نہ کریں۔ کیونکہ اس نے ایک بزرگ کی باتوں کو اپنایا اور سچ جانا تو اسے زندگی میں فائدہ ہی فائدہ ملا۔

افسانہ ''پنجرے والا گھر'' کا مرکزی کردار صاجی ہے جو اپنے والدین کی وفات کے بعد چودھرانی کی حویلی میں رہتی ہے۔ گاؤں کے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے اسے محبت ہو جاتی ہے۔ مگر چودھرانی جو جاگیر دار ہے وہ کیسے برداشت کرے گی کہ اس کی بیٹیاں کنواری بیٹھی رہیں اور اس کی نوکرانی کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ وہ وہی کرتی ہے جو ہمارے گاؤں کا جاگیر دار طبقہ صدیوں سے کرتا آیا ہے اور ہمارے دیہاتی صدیوں سے سہتے چلے آ رہے ہیں۔ صاجی کی شادی کر دی جاتی ہے۔ نہایت تنگی کی زندگی بسر کرتے کرتے صاجی اب بوڑھی ہو چکی ہے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ بوڑھی نہیں وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی ہے۔ اچانک سڑک سے گزرتے ہوئے ایک کار نے زوردار بریک لگائی تو اس نے دیکھا جس کار سے وہ ٹکرائی ہے اس کے اندر وہی نوجوان تھا، نوجوان نے آنکھوں سے چشمہ اتارا اور بولا:

''اندھی ہو گئی ہو مائی۔''(۱۴)

افسانہ ''مائی فٹ'' سیدھے سادھے دیہاتی کردار دکھائے گئے ہیں جو اپنے چودھری کے کہنے پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں اور چودھری ان پر اپنی مرضی کے حکم چلاتا ہے۔ حکم عدولی پر انکا جینا دوبھر کر دیتا ہے جبکہ دوسری طرف شہری اور دیہاتی زندگی کا فرق بھی دکھایا گیا ہے۔ کہاں ایک چودھری اپنے نوکروں پر حکم چلاتا ہے وہاں شہر کے ایک بس کنڈیکٹر کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بھی چوں چراں نہیں کرتا ہے۔ افسانہ ''اپنا اپنا کاگ'' کا مرکزی کردار ایک لڑکا ہے جو ایک پرندے کوے سے دوستی کر لیتا ہے کیونکہ یہ کوا اسے اس کی ماں اس

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.1 (2024)
(January-Mrach)

کے ماموں اور اس کی محبت کے پیغام پہنچاتا ہے۔ایک ایسا معاشرہ جہاں انسان ہی انسان کا دشمن دکھائی دیتا ہے مگر ان پرندوں سے مانوسیت اس لڑکے کی خوشی اور زندگی کا سہارا ہے۔جب یہ کوا کسی آندھی یا طوفان میں اپنی زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے تو اسے دنیا جیسے ویران لگنے لگ جاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے جن افسانوں کا دیہاتی پس منظر کے حوالے سے اس مقالے میں ذکر کیا گیا ہے ان افسانوی کرداروں کے ذریعے دیہات کی اصلی اور حقیقی زندگی ہمارے سامنے آتی ہے۔احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہاتی معاشرت کے حامل کردار ہماری مجموعی دیہاتی فضا پر حاوی ہو جاتے ہیں۔نیز یہاں پر ندیم صاحب کا مقصد صرف دیہات اور دیہاتی معاشرت کی تصویر کشی نہیں بلکہ مقصد عین انہیں پس منظر کے طور پر استعمال کر کے انسانی زندگی کے مسائل کو ابھارنا ہے۔ان افسانوں میں یہ دیہاتی کردار دیہی معاشرت کی ذبوں حالی کا محض نقشہ ہی نہیں کھینچتے بلکہ ان میں اس استحصال سے نجات کے لیے قوت عمل کی بیداری کی شدید لہر بھی موجود ہے۔ان کے ہاں دیہاتی رنگ کی انفرادیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا سارا بچپن وہیں گزرا اور بعد میں بھی ان کا اکثر چکر وہاں لگتا رہتا تھا۔اسی لیے انہوں نے دیہات کو قریب سے دیکھا سنا اور گہرا مطالعہ کیا جو ان کے دیہاتی کرداروں کو سمجھنے اور پیش کرنے میں موثر ثابت ہوا۔ منشایاد نے ان کرداروں کے ذریعے ہمارے دیہات کی کھردری مگر معصوم زندگی کو شہر کی مہذب لیکن منافق زندگی کو آمنے سامنے اس طرح لا کھڑا کیا ہے کہ انسان کا اصل روپ خود بخود ہمارے سامنے آجاتا ہے۔منشا نے دیہات کے حوالے سے غربت وافلاس، معاشرتی ناہمواری، احساس تنہائی، ذہنی انتشار، سوچ کا الجھاؤ، روح کی بے چینی اور جسم کی بھوک کو اپنے کرداروں کے توسط سے پیش کیا ہے۔لیکن یہ ایک اور بات ہے کہ منشایاد کی کتابوں پر احمد ندیم قاسمی کی نسبت کم لکھا گیا ہے اس کے باوجود بھی منشایاد نے ایک اہم ادبی مقام افسانوی دنیا میں بنا لیا جو ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت 1903تا2009ء، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ص674

۲۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان، بحوالہ: محمد عباس طوردی، "احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک" 2010ء، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ص:123

۳۔ احمد ندیم قاسمی، طلائی مہر، مشمولہ: بگولے، 2008ء، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص:337

۴۔ احمد ندیم قاسمی، توبہ میری، مشمولہ: بگولے، ص:343

۵۔ احمد ندیم قاسمی، سرخ ٹوپی، مشمولہ: بگولے، ص:465

۶۔ احمد ندیم قاسمی، گڑیا، مشمولہ: کپاس کا پھول، 1973ء، لاہور، مکتبہ فنون، ص:267

۷۔ احمد ندیم قاسمی، سفارش، مشمولہ: کپاس کا پھول، ص:248

۸۔ احمد ندیم قاسمی، سفارش، مشمولہ: کپاس کا پھول، ص:248

۹۔ احمد ندیم قاسمی، ماسی گل بانو، مشمولہ: کپاس کا پھول، ص:305

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، میرا دیس، مشمولہ: طلوع وغروب، 1962ء، لاہور، مکتبہ اردو، ص:687

۱۱۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت 1903تا2009ء، ص1127

۱۲۔ منشایاد، درخت آدمی، مشمولہ: درخت آدمی، 2009ء، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص:198

۱۳۔ منشایاد، سلاٹر ہاؤس، مشمولہ: درخت آدمی، ص:201

۱۴۔ منشایاد، پنجرے والا گھر، مشمولہ: اک کنکر ٹھہرے پانی میں، اسلام آباد، دوست پبل